

(۱۹۱۳ء-۱۹۹۹ء)

میرزا ادیب کا اصل نام دلاور حسین علی اور قلمی نام میرزا ادیب ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اسلامیہ ہائی سکول بھائی گیٹ لاہور سے میٹرک کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔ اے آنرز کیا۔

میرزا ادیب کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوا۔ اس زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور میں بہت سی علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں جنھوں نے میرزا ادیب کے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں معاونت کی۔ میرزا ادیب نے ابتدا میں شعر و شاعری کی طرف توجہ دی مگر جلد ہی اسے ترک کر کے افسانہ اور ڈراما نگاری کی طرف آ گئے۔

انھوں نے ۱۹۳۵ء میں رسالہ ”ادب لطیف“ کی ادارت سنبھالی اور طویل عرصے تک اس سے وابستہ رہے، پھر ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے۔

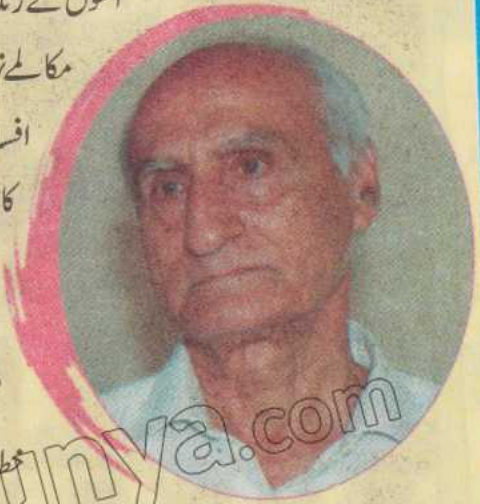
میرزا ادیب نے افسانہ نگاری اور ایک بانی ریڈیائی ڈراما نگاری میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد اردو ادب میں ایک بانی ڈرامے کو جو فروغ ملا، اس میں میرزا ادیب نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ معاشرے کے نبض شناس تھے، اس لیے ان کے ڈراموں کے موضوعات عام اور روزمرہ زندگی سے متعلق ہیں۔ اپنے معاشرے کی انسانی خواہشات اور توقعات کو میرزا ادیب نے خاص اہمیت دی ہے۔

میرزا ادیب نے کردار نگاری کے سلسلے میں بھی گہرے مشاہدے، انمول بصیرت اور فن کارانہ مہارت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے زندگی کے عام کرداروں کو افسانوی اور ڈرامائی کرداروں کا درجہ دیا ہے۔ ان کے مکالمے نہایت برجستہ، مختصر اور بر محل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں اور افسانوں میں قاری یا ناظر کی دل چسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے جو کسی کامیاب ڈراما نگار اور افسانہ نگار کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ ان کی اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

”آنسو اور ستارے“، ”لہو اور قالین“، ”ستون“، ”فصلِ شب“،

”خاک نشیں“، ”پس پردہ“ اور ”شیشے کی دیوار“۔ ان کے علاوہ ”صحرا نور کے

مخطوطات“، ”صحرا نور کے رومان“ اور ”مٹی کا دیا“ (آپ بقی) ان کی زندہ رہنے والی کتابیں ہیں۔



اولڈ ایچ ہوم

تندرستی مقاصد

- طلبہ کو افسانے کے موضوع یعنی معاشرے میں بزرگوں کی بے قدری اور تنہائی سے روشناس کرانا
○ سماجی رویوں، اخلاقی قدروں اور خاندانی نظام کے زوال اور انہدام پر تنقیدی نظر ڈالنا
○ افسانہ کے اسلوب، بیانیہ تکنیک اور علامتی معنویت کو سمجھنا
○ طلبہ کو نثری صنف خاکہ نگاری، افسانہ نگاری اور ذوقی، تشابہی الفاظ سے روشناس کرنا

آخری سیرھی اور اُس کے کمرے کے درمیان کم و بیش دس گز کا فاصلہ حائل تھا اور یہ فاصلہ اُس کے لیے ایک بڑی آزمائش کا مرحلہ بن جاتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہوتا تھا تو اُسے کسی قدر اطمینان ہو جاتا تھا کہ اُس کے پوتے اور پوتیوں کے حملے سے اس کا کمرہ محفوظ ہے مگر جب اس کے دونوں پٹ کھلے ہو جاتے تھے اور دروازے کے باہر کمرے کی کوئی نہ کوئی چیز پڑی ہوتی تھی تو اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی تھی اور چہرے کی بوڑھی رگیں زیادہ نمایاں ہو کر اس کی رب اُمید دلی کیفیت کا اظہار کرنے لگتی تھیں۔

اُس وقت کمرے کے دونوں پٹ کھلے تھے۔

”او میرے خدایا!“ اُس کے ہونٹوں سے بے اختیار نکلا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔
جس غارت گری کا اُس نے اندازہ لگایا تھا وہ صورتِ حال سے کچھ کم تر ہی تھی۔ اُس روز، محمود اور اس کی دونوں بہنوں نے معمول سے زیادہ ہی تباہی مچادی تھی۔

پلنگ کی چادر، جسے اس کی بہو نے صرف ایک روز پہلے بدلا تھا، اس پر جا بجا کھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ انھوں نے پلنگ پر بیٹھ کر کوئی میٹھی چیز کھائی کم اور گرائی زیادہ تھی اور ہر طرف بکھرے ہوئے ریزوں نے مکھیوں کو دعوت عام دے دی تھی۔

میز پر کتابیں وہ بڑی ترتیب کے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور انھی کا مطالعہ کر کے اپنا وقت بتاتا تھا۔ یہ ساری کتابیں منتشر حالت میں پڑی تھیں۔

قالین پہ اُگل دان اُلتا پڑا تھا۔ حقہ، کمرے کے ایک گوشے میں رکھا ہوتا تھا۔ وہ کمرے کے عین وسط میں اس عالمِ بیچارگی میں پڑا تھا کہ اُس کی چم غائب تھی اور چلم کے نوکے اوپر اُدھر دکھائی دے رہے تھے۔

پنشن کے لیے گھر سے جانے سے پہلے، وہ دھوبی سے اُچھلے ہوئے کپڑے لا کر کرسی کے اوپر رکھ گیا تھا کہ واپس آ کر انھیں الماری کے خانے میں رکھ دے گا۔ ان میں سے کوٹ نکل کر پلنگ پر پڑا تھا۔ محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا احان بننے کی کوشش کی ہوگی۔

ایسے میں اس کا صبر و قرار جواب دے جاتا تھا اور وہ کھڑکی سے منہ باہر نکال کر اپنی بہو کو بڑے غصے سے مخاطب کرتا تھا اور اس روز بھی

س نے یہی کیا تھا۔

”زینب! تم اپنے بچوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتیں، اوپر آ کر دیکھو تو، کیا حالت کروڑی ہے کمرے کی!“
بچے اپنے دادا جان کو گھر کے اندر آتے دیکھ کر چپکے سے کھسک جاتے تھے، اس لیے زینب انہیں بے خطا بددعا میں دینے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

”میں کیا کروں باباجی! آپ انہیں کیوں نہیں سمجھا لیتے؟“

اپنی بہو کا یہ رویہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ وہ تو سُسر کی غصیلی آواز سنتے ہی دروازے کی طرف بھاگتی تھی اور محمود یا اس کی کوئی بہن ہاتھ آجاتی تھی تو مار مار کر اس کا کچومر نکال دیتی تھی مگر اُس روز اُس نے ایک فقرہ کہہ کر ہی اپنی طرف سے معاملہ ختم کر دیا تھا۔

ماں بچوں کو بددعا میں دیتی تھی تو اُس کا غصہ بھی ذرا دب جاتا تھا لیکن اس روز اس نے جس ردِ عمل کا اظہار کیا تھا، وہ اُسے بڑا غیر مناسب لگا۔ وہ کھڑکی سے پرے ہٹ گیا۔ اُس کی پیشانی زیادہ شکن آلود ہو گئی تھی اور سانس شدید غصے کی حالت میں تیزی سے آنے جانے لگا تھا۔

”کیا اس نے بچوں کو شہ دی ہے؟“ اُس نے خود سے سوال کیا اور وہ نیچے آ گیا۔

زینب، نکلے کے نیچے گئے دھوری تھی۔ ”زینب! تم نے ان بدتمیزوں کو اتنی کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے؟ انہیں کمرے میں جانے ہی کیوں دیتی ہو؟ تمہیں خبر نہیں کہ میرے کمرے کے اندر جا کر وہ کیا کرتے ہیں؟“

زینب نے ہاتھ میں ڈنڈا اٹھا رکھا تھا جسے وہ کپڑوں پر مار رہی تھی۔ اپنے سُسر کے الفاظ کو اس نے بے دھیانی میں ڈنڈا، نکلے پر زور سے مار دیا اور چمک کر بولی: ”یہ میری کم بخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی ہے؟“

زینب اس کے سوال کا کیا جواب دے رہی تھی۔ اُس کے الفاظ نے جلتی پرتیل کا کام کیا تھا۔

”میری کچھ لگتی ہے یا نہیں لگتی مگر۔“

زینب تڑپ اٹھی۔ فوراً بولی۔۔۔ ”کچھ نہیں لگتی ناں؟“

”زینب! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری چیزوں کو اس طرح تباہ کیا جائے۔“

”تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔“

اُن کی بہو کو کیا ہو گیا ہے۔ ترکی بہ ترکی جواب دے رہی ہے۔ بیٹا بھی اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اُسے ضرور صورتِ حال کا علم ہو چکا ہے مگر نہ تو مایہ آ یا ہے نہ بچوں کی معمول کے مطابق سرزنش کی ہے۔

”اچھا! کچھ نہ ہو، پڑے گا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔“ اور وہ تیزی کے ساتھ دروازے سے باہر آ گیا۔

میرزا عبدالقیوم نے ساری زندگی صوبائی حکومت کے ایک دفتر میں ملازمت کی تھی۔ وہ معمولی کلرک سے اعلیٰ افسر کے عہدے تک پہنچا تھا اور اس کی ترقی کا حقیقی سبب اس کی ایمان داری، دیانت داری اور منہی فرائض ہے گہری دل چسپی تھی۔

ملازمت کے اختتام پر، دفتر کے سربراہ نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس کی دفتر سے وابستگی میں توسیع کر دی جائے مگر وہ خود اس پر راضی نہ ہوا۔

اپنے دوستوں سے تو اس نے یہی کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کام کر لیا ہے، اب یہ دوسروں کا حق ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ میں کسی کا حق مارنا نہیں چاہتا۔ اس کے دوستوں نے قطع ملازمت کا یہ جواز تسلیم کر لیا تھا لیکن دل کی بات اس نے کسی سے بھی نہیں کہی تھی اور دل کی بات یہ تھی کہ وہ دفتری ہنگاموں سے دور ہو کر بڑے پرسکون ماحول میں بقیہ زندگی بسر کرنے کا آرزو مند تھا۔

”خاموشی، سکون اور اپنا دن اور اپنی رات۔“ یہ تھی اس کی آرزو جو چھٹی کے وقت اپنے کاموں سے فراغت پانے کے بعد یا گھر میں اپنے مخصوص کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے اُس کے دل و دماغ میں چھا جاتی تھی اور وہ ان لمحوں کی گود میں چلا جاتا تھا جب دفتر سے رشتہ منقطع کرنے کے بعد خاموشی، سکون اور اپنے سارے معمولات میں مکمل آزادی حاصل کر لے گا۔ اس ماحول کا تصور کرتے وقت اُسے ایک عجیب سی خوشی مل جاتی تھی اور وہ دیر تک اس تصور میں ڈوبا رہتا تھا۔

پہلے دن جب صبح اُٹھ کر اُس نے یہ خیال کیا کہ اب سارا دن اس کا اپنا ہے اور اُسے کہیں بھی آنا جانا نہیں ہے۔ کوئی بھی فریضہ ادا کرنا نہیں ہے تو اس کا دل سرخوشی کی ایک ایسی کیفیت محسوس کرنے لگا جسے وہ اپنی تمام تنگ و دو کا حاصل سمجھتا تھا۔

وہ خوش تھا، مطمئن تھا۔ اُس نے اپنے کمرے کو ٹھیک کرنے کا ارادہ کیا اور اپنی بہو سے جو بچوں کے ساتھ ناشتے کر آگئی تھی، کہا: ”زینب! اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرہ، اسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”ضرور باباجان! جو کچھ آپ چاہتے ہیں ہو جائے گا، حکم کیجیے۔“ اُس کی بہو نے ٹرسے میز پر لاکھتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ صوفہ سیٹ پرانا ہو گیا ہے۔“

”نیا خرید لیں گے۔“

”میز بھی نئی۔“

”بس ٹھیک ہے۔“

اُس کی بہو مسکرا رہی تھی۔

”باباجان! میں آج ہی پرانی چیزیں نکلوالوں گی۔ صوفہ سیٹ خرید لائیں گے اور بھی سب کچھ۔۔۔ محمود کے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ باباجان اب گھر پر ہی رہا کریں گے۔ انھیں ہر طرح آرام پہنچائیں گے۔“

چند روز میں کمرہ ٹھیک ہو گیا، اسے ٹھیک کرنے میں اُس نے خود کم اور گھر والوں نے زیادہ حصہ لیا تھا۔

ایک ہفتہ اس انداز میں گزرا جس انداز میں وہ گزارنا چاہتا تھا۔ دفتر کے پرانے ساتھی اس سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ اُس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چائے اور کھانا اس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔ اس قسم کا ہنگامہ ضرور رہا لیکن اُسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ احباب آتے ہیں تو آئندہ آنے سے رُک جائیں گے۔ اس کی بہو بچوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے میں جو شور کرتی ہے، یہ بھی اُس وقت ختم ہو جائے گا یا بہت حد تک تھم جائے گا، جب وہ ان کی ماں کو سمجھا دے گا کہ بچوں کے ساتھ مادرانہ شفقت کا رویہ اختیار کر لے۔ بچے اوپر آتے ہیں، اپنے

جوتوں کے ساتھ اندر آ کر قالین خراب کر دیئے ہیں۔ تو یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، وہ انھیں بتا دے گا کہ اوپر میرے کمرے میں آؤ تو جوتے اتار کر آؤ۔

تین ہفتے بیت گئے اور پھر اُس کے ذہن میں اندیشہ ہائے دور دراز اپنا سایہ ڈالنے لگے۔ اُس نے سوچا تھا کہ دفتر کے کچھ لوگ آتے ہیں تو اظہار محبت کے لیے آتے ہیں۔ آخر کب تک یہ اظہار ہوتا رہے گا، مگر اتنی مدت صبر سے کام لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یہ سلسلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔

پہلے اُس کے پرانے اور نئے ساتھی محض اسے، اُس کے شان دار کیریئر (career) پر مبارک باد دینے کے لیے آتے تھے۔ اب وہ اُس سے ہدایات لینے کے لیے آنے لگے تھے۔

”سر! ایسے کاغذات کن فائلوں میں رکھے جاتے ہیں؟ بڑے افسر کے ہاں جا کر سوال کس طرح کرنا چاہیے؟“

یہ لوگ عام طور پر یہی سوال کرتے تھے اور وہ جواب دے دے کر بور ہو جاتا تھا۔ اس سے بڑی کوفت اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں سے ہونے لگی تھی۔ وہ سیر و تفریح کی خاطر، کسی سے ملاقات کے لیے، کوئی چیز خریدنے کے لیے گھر سے باہر نکلتا تھا تو بچے سکول سے واپس آ کر گھر میں ہونے لگتے تھے تو بچے مختلف اُس کے کمرے میں آ جاتے تھے اور طوفان بدتمیزی مچا دیتے تھے۔ چیزوں کی بے ترتیبی دیکھ کر اُسے دکھ ہونے لگا تھا۔

اپنے کمرے کی تباہی پر اسے ہر بار ذہنی کوفت ہوتی تھی مگر جب اس کی بہویچوں کی لڑائی لڑا کر انٹ ڈیپٹ دیتی تھی بلکہ کسی نہ کسی کی پٹائی بھی کر دیتی تھی اور اُس کا بیٹا بھی اگر گھر میں ہوتا تھا تو اس ڈانٹ ڈپٹ میں حصہ لینے سے باز نہیں رہتا تھا تو اس کا غصہ کسی قدر ہلکا ہو جاتا تھا اور وہ آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آ جاتا تھا، مگر اُس روز تو ان دونوں نے ایک ایسا رویہ اختیار کر لیا تھا جو اُس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ بہو کا فقرہ: ”تو میں کیا کر سکتی ہوں، پکڑ کر گلے گھونٹ دیں ان کے۔“ اس کے ذہن پر مسلسل ضربیں لگا رہا تھا۔

وہ بغیر کسی مقصد کے گلیوں اور بازاروں کے چکر لگا رہا تھا۔ باغوں میں گھوما، کتابوں کی دکان پر کچھ کتابیں خریدیں اور ایک اخبار بھی۔ گھر پہنچ کر وہ کسی سے کچھ کہے نئے بغیر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر گر کر ایک نئی کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کتاب پڑھنا ممکن نہیں تھا اور اس کے اعصاب پر کچھ ایسا بوجھ پڑ چکا تھا کہ بستر سے اٹھ کر بجلی کے سوئچ بورڈ تک جانا دو بھر لگ رہا تھا۔

وہ کتاب بند کر کے لیٹ گیا۔

بہو اور بیٹے کی بازیابی کے لیے یاد آ گئی اور اپنے وہ الفاظ بھی جو اُس نے گھر سے نکلتے وقت اپنی بہو سے کہے تھے ”اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ تم لوگ چاہتے ہو کہ میں گھر سے نکل جاؤں۔“

”مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟ کہاں سر چھپاؤں جا کر؟ کدھر جا سکتا ہوں؟“

یہ سوچ کر اس پر ایک گہری افسردگی طاری ہو گئی۔

اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اچانک اُس کی سیدھی آنکھوں پر کسی نرم سی شے نے مس کیا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی بڑی پوتی کلثوم پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”دادا ابو! سو گئے تھے آپ؟“

”کیوں آئی ہو یہاں؟“ وہ گرجا۔

بچی کی آنکھوں میں جو میٹھی سی معصومانہ مسکراہٹ جھلک رہی تھی، فی الفور غائب ہو گئی۔

”دادا ابو!“

وہ آگے کچھ نہ کہ سکی۔

”کیا ہے؟“

وہ دوبارہ گرجا۔

”وہ۔۔۔ دادا ابو! کھانا۔۔۔“

”نہیں! بھوک نہیں ہے مجھے۔ بھابھا جادو کر!“

کلثوم کمرے سے باہر جانے لگی۔

جب وہ کمرے میں آیا تھا تو اُس نے ادھر ادھر نظر نہیں ڈالی تھی۔ آتے ہی بس پرائیڈا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ کمرے کی صفائی ہو گئی

ہے مگر کتابیں بدستور منتشر ہیں۔

”جاہل عورت!“

وہ اپنی ان پڑھ بہو کو جاہل سمجھتا تھا۔ اُس کے بیٹے نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ شروع ہی سے بہو کو پسند نہیں کرتا تھا، اگرچہ وہ اُس کے

آرام کا ہر طرح خیال رکھتی تھی۔

چند منٹ بعد بہو اور بیٹا آ گئے۔

”بابا جان! کھانا کھا لیجئے نا۔“ یہ اُس کی بہو کے الفاظ تھے۔

”نہیں! کہ جو دیا، بھوک نہیں ہے۔ کیوں پریشان کرتے ہو مجھے؟“

”مگر ابو! آپ نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔“ اس کا بیٹا بولا۔

باپ نے تسلیں نظر میں سے پیلے کود دیکھا اور مٹے نے نظر میں جھکا لیں۔ کچھ اور اصرار کرنے کے بعد دونوں مایوس ہو کر چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد اُس نے پھر کتاب اٹھائی لیکن آدھ صفحہ پڑھ کر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ سرہانے کے اوپر اخبار بھی کھلا ہوا پڑا تھا۔

کتاب ایک طرف رکھ کر اُس نے اخبار اٹھا لیا۔ وہی دہشت ناک خبریں تھیں جو اخباروں میں نمایاں طور پر چھپتی ہیں۔ یکا یک اُس کی نگاہ

ایک اشتہار پر پہنچ کر رک گئی۔

اس اشتہار میں امریکی طرز پر ایک اولڈ ایج ہوم (Old Age Home) کے قیام کی خوش خبری سنائی گئی تھی اور اُن بوڑھے مردوں اور بوڑھی عورتوں کو اس ہوم کے مالک احمد جاوید سے ملنے کو کہا گیا تھا جو بڑھاپے میں پُر سکون زندگی بسر کرنے کے آرزو مند ہیں۔ نیچے احمد جاوید کا پتہ درج تھا۔

اُس نے سانس روک کر یہ خبر پڑھی۔

یہ تو بہت ہی اچھی خبر ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا اور اخبار کو لپیٹ کر تپائی کے اوپر رکھنے سے پیش تر وہ تین بار اس اشتہار کو پڑھ چکا تھا۔

صبح اُس کی بہو ناشتا لے کر آ گئی۔

”باباجی! خدا کے لیے انکار نہ کریں۔“

بہو نے یہ الفاظ بڑی لجاجت سے کہے تھے، اُس نے بہو کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور وہ اپنے سر کو بڑی ممنونیت سے دیکھنے لگی۔

جلدی جلدی ناشتا کرنے کے بعد اس نے لباس تبدیل کیا اور احمد جاوید سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گیا۔

احمد جاوید کی عمر پچاس بچپن سے کم نہیں تھی مگر بڑا چاق چو بند دکھائی دیتا تھا۔ لباس فیشن کے مطابق، چوڑی پیشانی اور آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ بڑی خوشی سے اس نے خیر مقدم کرتے ہوئے اُسے اپنی کونجی کے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ نام وغیرہ پوچھا۔ حالات دریافت کیے اور جب اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ جس شخص سے وہ ملاقات کر رہا ہے وہ ہوم میں داخل ہونے کے لیے بے قرار ہے تو بولا:

”مجھے، آپ کی تشریف آوری پر بڑی خوشی ہوئی ہے۔ آپ کی خواہش کی تکمیل کر کے مجھے اور خوشی ہوگی۔ میں نے اپنی زندگی کا ایک اچھا خاصہ حصہ امریکا میں گزارا ہے۔ اس کی کچھ چیزیں مجھے پسند نہیں آئیں۔ کچھ پسند آئی ہیں اور ایک چیز جو بہت زیادہ پسند آئی ہے وہ اولڈ ایج ہوم کا سسٹم ہے۔ میں کئی بار اس قسم کے ایک ہوم میں گیا تھا اور وہاں رہنے والوں کو بہت مسرور اور مطمئن پایا تھا۔ سچ کہتا ہوں اُن کے چہروں پر مجھے جو سکون نظر آیا تھا وہ قابل رشک تھا۔“

احمد جاوید نے ذرا رک کر اپنے ملاقاتی کا غور سے چہرہ دیکھ کر، اُس کے ردِ عمل کو بھانپنے کی کوشش کی۔ یہ ردِ عمل اُس کی منشا کے عین مطابق تھا۔

”میں نے قیام امریکا کے دوران ہی اپنے ہاں اولڈ ایج ہوم بنانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ میرے محترم! آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہوں گے کہ سن رسیدہ افراد کو بڑے سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ان بے چاروں کو نہیں ملتا۔ اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر میں نے زکیر صرف کر کے ایک بہت آرام دہ اور ہر لحاظ سے مکمل ہوم بنالیا ہے۔ اخراجات کے لیے بڑی معمولی رقم مقرر کی ہے۔“

”صرف ایک ہزار ماہانہ! جو ہوم کی سہولتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے۔“

”ٹھیک۔ اور کچھ؟“

”اور کچھ؟ بس آپ چلیے میرے ساتھ۔ میں آپ کو ہوم دکھا دوں۔“

چائے پینے کے دس منٹ بعد وہ احمد جاوید کے ساتھ ایک خوب صورت، بچے بجائے کمرے میں کھڑا تھا۔ اس کمرے میں، سب کچھ موجود تھا۔ صوفہ سیٹ، کرسیاں، میز، تپائیاں، بک شیلف، الماریاں۔ فرش پر قالین، دیواروں پر رنگارنگ تصویروں۔ ایک طرف وال کلاک۔ احمد جاوید نے مزید سہولتوں کی تشریح کی۔
 ”ایک ملازم اور ایک ملازمہ خدمت کے لیے حاضر ہیں۔ گھنٹی بجائیے، ایک منٹ میں موجود۔ ناشتا، کھانا وقت پر اور کیا چاہیے پرسکون زندگی کے لیے؟“

اُسے کمرہ بہت پسند آیا۔

”اور کمرے بھی ہوں گے اور ان میں؟“

احمد جاوید بات سمجھ گیا۔

”اور کمرے ضرور ہیں مگر جیسا کہ میں بتا چکا ہوں ابھی اس سسٹم کی ابتدا ہوئی ہے۔ لوگ آتے جائیں گے اور ایک دن یہ ہوم واقعی اولڈ ایج ہوم بن جائے گا۔“
 ”تو ابھی صرف ہیں؟“

احمد جاوید نے جواب دیا۔

”آپ کی طرح ایک صاحب آئے تھے۔ بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ افسوس انھیں ایک پرانی بیماری نے کچھ زیادہ مدت خوشی سے زندگی بسر کرنے نہ دی۔ فوت ہو گئے۔“

اُس دن دوسرے پہر وہ اپنی کتابیں اور کپڑے لے کر، گھر والوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر احمد جاوید کے اولڈ ایج ہوم میں آ گیا۔ شام تک سارا وقت بک شیلف میں کتابیں ترتیب کے ساتھ رکھنے، کمرے کے فرنیچر کا اچھی طرح جائزہ لینے، نوکر اور نوکرانی سے تعارف ہونے میں گزر گیا۔ نوکر کا نام بخشو تھا اور نوکرانی رشتے میں اس کی خالہ تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔
 ہاجرہ نے بڑے سلیقے سے چائے کی ٹرے اُس کے آگے تپائی پر رکھی تھی اور خود مودب ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔

”بس جاؤ!“

”جی کوئی حکم؟“

”نہیں کوئی نہیں۔“

کتنی تربیت یافتہ نوکرانی ہے۔ اُسے اپنی بہو یاد آگئی جو اس کے ایک مرتبہ کہنے پر اوّل تو چائے بھیجتی ہی نہیں تھی، دو تین بار کہتا تھا تو کوئی بچہ چائے لے کر آ جاتا تھا جو کافی ٹھنڈی ہوتی تھی۔ دو تین گھنٹے بھر کردہ پیالی ہاتھ سے رکھ دیتا تھا اور جب سیر کے لیے باہر جاتا تھا تو کسی ریسٹوران میں بیٹھ کر خوش گوار ماحول میں چائے پی لیتا تھا۔
 چائے پینے کے بعد اُس نے کھڑکی کا پٹ کھول کر فضا میں دیکھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس روز فضا کچھ بدلی بدلی لگتی تھی۔ ہوا کے

ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں نے اُس کے ماتھے کو چھوا تو اسے ایک ٹپ لڑت کا احساس ہوا۔
 ”خواہ مخواہ اتنا وقت اُس منحوس گھر میں بتایا۔ کاش! اس موسم کا علم ریٹائرمنٹ کے وقت ہی ہو جاتا۔“ اُس نے سرد ہوا میں لمبا سانس لے کر سوچا۔

شام کو کمرے سے باہر نکلا اور سیر کو روانہ ہو گیا۔
 گھٹنا بھر ادھر ادھر گھومنے کے بعد کمرے میں آ گیا۔ احمد جاوید کرسی میں بیٹھا اس کا منتظر تھا۔
 ”ویکم سر!“ تعظیماً اُس نے اُٹھ کر کہا۔
 ”شکریہ۔“

”میں صرف یہ پوچھنے حاضر ہوا ہوں کہ کسی قسم کی دقت، کوئی تکلیف؟“ احمد جاوید نے کرسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔
 ”جی بالکل نہیں! بہت خوش ہوں۔“

آپ یہاں ہمیشہ خوش ہی رہیں گے۔ جلد ہی ایک صاحب آجائیں گے۔ تنہائی نہیں رہے گی۔
 ”کوئی صاحب؟“ اُس کا سوال تھا۔
 جی ہاں۔ انھیں بھی بڑھاپے میں سکون کی تلاش ہے۔ جلد جلد اپنے معاملات پتار ہے ہیں۔ بڑے خوش مزاج آدمی ہیں۔ امریکا میں بھی کئی سال گزار چکے ہیں۔ یہ آپ کے ساتھی بنیں گے۔
 ”بہت خوب!“

اور احمد جاوید شب بخیر کہہ کر چلا گیا۔

رات کا کھانا آ گیا۔ سادہ کھانا تھا مگر مزے دار۔ کھانا کھا کر اس نے چائے منگوائی اور اس سے فارغ ہو کر، کچھ دیر ایک کتاب کا مطالعہ کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

”یہی سکون ہے، جس کی مجھے تلاش تھی۔ خوش قسمت ہوں کہ میرا خواب پورا ہو گیا ہے۔“
 وہ جب تک جاگتا رہا، ایسے ہی خوش آئند تصورات اس کے ذہن پر چھائے رہے، پھر وہ سو گیا۔
 صبح اٹھا تو اس کا جی بے اختیار چاہا کہ کچھ گنگنائے:

خدا جانے یہ کس کو دیکھ کر، دیکھا ہے دنیا کو
 کہ جو شے ہے، نگاہوں کو حسین معلوم ہوتی ہے

دوسرا مصرع وہ بار بار گنگناتا رہا۔
 ملحقہ غسل خانے میں وہ نہایا دھویا۔ نکلا تو چائے کی ٹرے تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔
 ”یہ سہولت، اس منحوس گھر میں کہاں تھی؟“
 چائے پی کر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔

فضا میں روشنیاں اترتی چلی جا رہی تھیں۔ بازاروں اور سڑکوں پر زندگی جاگ اٹھی تھی۔ بچے دو دو تین تین کی ٹولیوں میں مدرسوں کو جا رہے تھے۔ اُسے اپنے پوتے اور پوتیوں کا خیال آ گیا۔ ”بدمیز کہیں کے!“ اور وہ کھڑکی سے الگ ہوا۔ سکون کے دن تھے، سکون کی راتیں تھیں اور وہ خود کو ایک ایسا پیچھی محسوس کرتا تھا جو پنجرے کی قید سے رہائی پا کر فضا کی وسعتوں میں پوری آزادی کے ساتھ اڑ رہا ہو۔

ایک ہفتہ بیت گیا۔ ایک اور ہفتہ بیتا اور وہ شام کی چائے پی کر سیر کے لیے جانے ہی والا تھا کہ اناں ہاجرہ نے اوپر آ کر اُسے اطلاع دی کہ آپ کے گھر والے آئے ہیں۔

”کیا ہے؟ آگئے ہیں تو ہوا کیا ہے؟ مجھے واپس لے جانے سے تو رہے۔ چلے جائیں گے تھوڑی دیر بیٹھ کر۔“

”بلا لو۔“

اُس کا بڑا بیٹا اور پوتا اور پوتیاں آ گئیں۔ بہو نے پھل کی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔

”سلام علیکم ابو! سلام علیکم باباجی! دادا جان سلام علیکم!“

آوازیں بلند ہوئیں۔ اس نے سر کی جنبش سے جواب دیا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میاں بیوی صوفے پر اور بچے نیچے بیٹھ گئے۔

”ابو! آپ یہاں خوش ہیں؟“ اُس کے بیٹے نے سوال کیا۔

”بہت خوش ہوں۔ بہت مطمئن ہوں۔“

”اچھا بڑی اچھی بات ہے۔ ہمیں دکھ ہے کہ آپ کو خوش اور مطمئن نہیں کر سکے تھے۔“ بیٹے کے لہجے میں دبا دبا دکھ تھا۔

”باباجی! اسے کیا کہتے ہیں؟“ بہو نے پوچھا۔

”اولذا تاج ہوم۔“

اول بہو کی زبان پر پہلا لفظ ہی نہ آ سکا۔ ”یہ ہوتا کیا ہے باباجی؟“

اس نے گلو خلاصی کے لیے دونوں ہاتھ لہرائے۔ ”تم نہیں سمجھ سکتیں۔“

بیٹے نے باپ کو پھل کی ٹوکری دی۔

”مجھے یہاں کسی شے کی کمی نہیں ہے۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ لے جاؤ بچوں کے لیے۔“

”نہیں ابو! یہ آپ کے لیے لائے ہیں۔“

باپ نے بیٹے کی طرف ٹوکری بڑھادی تھی۔

اس دوران بچوں نے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ دادا، محمود کی طرف دیکھتا تھا تو وہ فوراً اپنا سر جھکا لیتا تھا۔ یہی حال اُس کی بہنوں کا بھی تھا۔

”کتنی چالاکی سے تمیز داری کا ڈراما کر رہے ہیں!“ یہ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا پڑا۔

گھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کون کون اسے ملنے کے لیے گھر آیا اور اسے کیا بتایا گیا۔ ہم ایوان کے سامنے اس کے بارے میں کیسی کیسی غلط بیانی کی گئی۔ یہ سب کچھ اُسے بتایا گیا۔

”خبردار! کسی کو بھی یہاں کا علم نہ ہو۔“ اس نے تاکید کہا۔

”جی ابو! ہم نے کسی کو نہیں بتایا۔ آپ نے جو کہہ دیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“

وہ جانے لگے تو بیٹے نے ایک بڑا سالفافہ باپ کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ وہ خط تھے جو اس کے نام اس کی عدم موجودگی میں آئے تھے۔

اُن کے چلے جانے کے بعد اُس نے لفافے سے خط نکالے اور ایک ایک کو پڑھنے لگا۔

ایک خط کتابوں کی ایک دکان سے آیا تھا جس میں اسے ”NEW ARRIVALS“ کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔ دوسرا خط اس کے کھانے کی دکان سے آیا تھا جس میں اس سے درخواست کی گئی تھی کہ اپنے پرانے ساتھی فیروز دین کی الوداعی پارٹی میں شامل ہو کر ممنون فرمائے۔ دو خطوں میں اُس کے دوستوں نے اپنے بیٹوں کی شادی پر اُسے مدعو کیا تھا۔ کتابوں کی دکان والا خط اُس نے تیکے کے نیچے رکھ لیا اور باقی پھاڑ کر روڈی کی ٹوکری میں ڈال دیے۔

”اب میرا ان لوگوں سے کیا تعلق واسطہ؟“

ایک مہینا گزر گیا۔ نوکر اور نوکرانی نے اپنی ذمہ داریوں میں کبھی کسی قسم کی بے قاعدگی نہیں کی تھی مگر اس روز صبح کی چائے پیچھے بچے کی بجائے ساڑھے سات بجے ملی۔

”ماف کر دو باباجی!“ ہاجرہ نے خود ہی کہنا شروع کر دیا۔ ”چائے دیر سے ملی۔ دیر سے جو آئی ہوں۔“

”اچھا۔“ اُس نے ہاجرہ کے الفاظ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

”وہ جی۔۔۔ ہمارا ہو گیا تھا۔“

”کون بیمار ہو گیا تھا؟“ اُس نے یوں ہی سوال کر دیا اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”جی وہ میرا پوتا جی۔ بڑا فکر ہے جی۔ ہمارا ہی چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا دھیان اُسی میں لگا ہوا ہے۔ دعا کریں، بزرگ ہیں۔ ٹھیک ہو جائے۔“

وہ گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا اور وہ ملتجیانہ نظروں سے اُسے دیکھتی رہی۔

”دعا کریں گے ناں!“

اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ناشتا تھوڑی دیر بعد یا ابھی؟“ ہاجرہ نے ٹرے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

”تھوڑی دیر بعد۔“

اور یہ الفاظ سن کر وہ چلی گئی۔

وہ جب کھڑکی کی طرف جا رہا تھا تو اُسے اپنے پوتے کا خیال آ گیا اور اس کے ساتھ ہی پوتے اور پوتیاں کے چہرے اس کے سامنے آ گئے۔ ”اُس روز کتنے مؤدب ہو کر یہاں بیٹھے تھے!“ وہ مسکرانے لگا۔
دھوپ پھیل چکی تھی۔ بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اُس کی نگاہیں دور سکول کی عمارت پر پڑیں۔ بچے قطاروں میں کھڑے تھے۔ دعا کر رہے ہوں گے۔ وہی دُعا جو اُس کا پوتا اور پوتیاں گھر آ کر کبھی کبھی اُسے سنایا کرتی تھیں۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تنہا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

وہ کھڑکی میں کھڑا رہا۔ قریب کمرے کے اندر شور ہوا۔ اُس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ بخشو تھا جو ناشتا لے کر آیا تھا۔ بیڈ ٹی (Bed Tea) اور ناشتا ہاجرہ ہی لایا کرتی تھی۔ ناشتے کے بعد بخشو حقہ تازہ کر کے لاتا تھا۔ ناشتا لانا اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہیں تھا۔

”ہاجرہ کہاں ہے؟“ اُس نے کھڑکی سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اُسے اپنے پوتے کا بڑا فکر ہے۔ گھر چلی گئی ہے۔“

”زیادہ بیمار ہو گیا ہے؟“

”کہتی تھی بڑا کم زور ہو گیا ہے۔“

وہ کرسی میں بیٹھ کر ناشتا کرنے لگا۔ چند منٹ گزرنے پر بخشو حقہ لے آیا۔

”تازہ اخبار لے آؤں بازار سے؟“

”نہیں، میں خود لے آؤں گا۔“

ناشتا کرنے کے بعد وہ بڑے اطمینان کے ساتھ حقے کے کش لگا تا تھا۔ اس وقت بھی وہ کش لگا رہا تھا اور جلد باہر نکلنا چاہتا تھا۔
اخبار خرید کر وہ اپنی منزل متعین کیے بغیر چلتا گیا۔ اخبار کی بڑی خبریں وہ کسی باغ میں بیٹھ کر پڑھتا تھا۔ اُس روز بھی ایک باغ کے اندر بیٹھ کر پڑھتا تھا۔

ایک دم شور مچا ہونے لگا۔ اُس نے سامنے دیکھا۔ لڑکے آدھی چھٹی کے وقت خوش خوش شور مچاتے ہوئے اپنی اپنی کلاسوں سے نکل رہے تھے۔ اُسے سکول کی عمارت شناسا محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اُس کا پوتا اور پوتیاں پڑھتی ہیں۔

”پتا نہیں میں یہاں کیسے آ گیا؟“

وہ اخبار سرسری طور پر دیکھنے لگا۔ چند منٹ میں سارا اخبار دیکھ لیا۔ اٹھا تو اُس کے پاس وہ بیٹیاں بھی تھیں۔
”تم؟“



”ٹھیک ہو؟“

پھر اسی طرح سر ہلنے لگے۔

”دادا ابوجی۔ ہم۔۔۔“

”کبھی۔۔۔ دادا ابوجی۔۔۔۔۔“ کلثوم بس اتنا کہ سکی۔

نرگس نے کچھ نہ کہا صرف اپنا سر ہلاتی رہی۔

”کیا یہ وہی بچے ہیں جنہوں نے اسے اس قدر پریشان کر دیا تھا۔ اب کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ آخر چھٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ سکول کی گھنٹی اس کا اعلان کر رہی تھی۔

”جاؤ اپنی کلاسوں میں!“

اب وہ دروازے سے باہر نکلنے لگا۔ باہر نکل کر وہ بغیر ارادے کے رُک گیا اور مڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ تینوں ابھی تک وہیں کھڑے تھے اور اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ واپس چھپ چکا۔ بخشتو کمرے کی صفائی کر چکا تھا۔

”جناب! یہ آپ کا ہے؟“ بخشتو کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا۔ ”صفائی کرتے ہوئے، وہاں سے ملا ہے۔“ بخشتو نے کمرے کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں۔ میرا تو نہیں۔۔۔ دکھاؤ۔“

اُس نے لفافہ لے لیا۔

”شاید یہ اُن صاحب کا ہے جو پہلے یہاں رہتے تھے۔“

”وہ باباجی۔۔۔ بے چارے یہیں مر گئے تھے۔۔۔“ بخشتو نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ ”کھانا کتنے بچے جی؟ ہاجرہ نہیں ہے ناں۔“

”میں بھی پکا لیتا ہوں جی!“

”جب پکا چکو تو لے آنا۔“

بخشتو چلا گیا۔

وہ کرسی میں بیٹھ گیا تھا۔ لفافہ ابھی تک اُس کے ہاتھ میں تھا۔ لفافے پر پتہ درج تھا۔

برخوردار الطاف احمد،

مکان نمبر ۳۱۔ ڈی۔ محلہ ست رنگاں، انڈرون موچی گیٹ، لاہور۔

”یہ الطاف احمد کون تھا؟ برخوردار کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط لکھنے والے کا کوئی چھوٹا عزیز ہوگا۔ ممکن ہے بیٹا ہو۔ تو اس نے بیٹے

کو کیا لکھا تھا اور یہ خط پوسٹ کیوں نہیں ہوا تھا؟ یہیں کیوں پڑا رہا؟“



ایسے سوالات نے اُس کے ذہن کا احاطہ کر لیا تھا۔
 ”اب وہ تو ہے نہیں جس نے خط لکھا تھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔“ اس نے غصے سے کہہ کر اپنے لیے جواز تلاش کر لیا۔
 ذرا سی ہچکچاہٹ۔۔۔ اور پھر لفافہ چاک ہو چکا تھا۔ وہ پڑھنے لگا۔ الفاظ ٹیڑھے میڑھے تھے۔ لکھا تھا اے اے کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔

”میرے عزیز بیٹے!

تم پر اللہ کی سلامتی ہو!

چار دن سے میری حالت کافی خراب ہو گئی ہے۔ ہارٹ بار بار تنگ کرتا ہے۔ زندگی سے اب مایوسی ہی مایوسی ہے۔
 میرے عزیز اور پیارے بیٹے! تمہاری ماں کے انتقال کے بعد میں بُری طرح یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ بالکل بے آسرا اور بے سہارا ہو گیا ہوں۔ مجھے تم سے، تمہاری آپا سے یہ شکایت ہو گئی تھی کہ تم لوگ میری پروا نہیں کرتے۔ تم لوگوں کا سارا وقت اپنے بچوں، دوستوں اور سہیلیوں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس کا رد عمل یہ ہوا تھا کہ میں اپنے گھر سے بے زار ہو گیا تھا۔ چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں۔ اُنھی دنوں احمد جاوید سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ امریکا میں اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں اولڈ ایج ہوم، بوڑھوں کے لیے ایک جنت ہوتی ہے، جس میں رہنے والے بڑی پرسکون زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس نے اس امریکا ہوم بتالیا تھا اور میں اس کی باتوں سے متاثر ہو کر اُس کے ہوم میں آ گیا تھا۔

یہ چند ہفتے جو میں نے یہاں گزارے ہیں میرے لیے عارضی سکون لے کر آئے تھے۔ بیٹا! جب سے بیمار ہوا ہوں، تم سب لوگ مجھے بہت یاد آ رہے ہو۔ اپنے کنبے کی جدائی مجھ پر شاق گزرنے لگی ہے۔

الطاف بیٹے! اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں نے ایک بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یورپ میں گھر کا کیا تصور ہے میں نہیں جانتا، مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دنیا ہوتی ہے جس میں رہنے والے ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ انھیں الگ الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ایک درخت کی طرح جس کی شاخیں زمین کے اندر ایک دوسری سے گتھی ہوئی ہیں۔ ہمارے گھر، بزرگوں کی شفقتوں، جوانوں کے قہقہوں اور بچوں کی معصوم مسکراہٹوں سے آباد رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ ہماری زندگی کی رونق ہے۔ ہماری زندگی کی بہار ہے۔ اسی میں زندگی کا سارا حسن ہے۔

یہاں تمہاری مجھے اندر ہی اندر چاٹتی رہی ہے۔ مجھے اب اس کا علم ہوا ہے۔ میرے پیارے بیٹے! آؤ اپنے بیمار اور لاچار باپ کو اُس گھر میں لے جاؤ جس میں اس کا جتنی سکون ہے۔ آؤ! الطاف! جلدی آؤ۔۔۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

یہ تحریر پڑھ کر اس کے اندر ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ وہ کرسی سے اٹھ بیٹھا اور اپنے لگا۔ وہ کئی منٹ تک ٹہلتا رہا۔

بخشوا یا۔ ”جناب! کھانا لے آؤں؟“

”مجھے یہ بتاؤ یہ خط یہیں کیوں پڑا رہا؟“

www.ilmkidunya.com

بخشو سوچ کر بولا، ”جناب! میں نہیں جانتا۔ اُس نے ہاجرہ کو دیا ہوگا۔ وہ بھول گئی ہوگی۔“

”اس کے گھر سے کوئی آیا تھا؟“

”مرنے کے بعد اس کا بیٹا آیا تھا اور میت لے گیا تھا۔“

وہ پھر کمرے میں پھرنے لگا۔

”کھانا لے آؤں جناب؟“ بخشونے پوچھا۔

اُس نے ملازم کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی کتابیں اور کپڑے ایک طرف رکھنے لگا۔ بخشو اُسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

(گلی گلی کہانیاں)

مشق

سبق ”اولڈائج ہوم“ کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات تحریر کریں:

- i ”اولڈائج ہوم“ سے کیا مراد ہے؟
- ii افسانے کے مرکزی کردار کا کیا نام ہے اور وہ کس عہدے سے سبک دوش ہوئے؟
- iii ”اولڈائج ہوم“ قائم کرنے والے کردار کا نام کیا ہے؟
- iv ”یہ میری کم بخت اولاد ہے تو آپ کی کچھ نہیں لگتی؟“ یہ الفاظ کس نے کس سے کہے؟
- v ”اولڈائج ہوم“ میں کام کرنے والے بخشو اور ہاجرہ کا آپس میں کیا رشتہ تھا؟
- vi میرزا عبدالقیوم نے اپنا پہلا دن ”اولڈائج ہوم“ میں کیسے گزارا؟
- vii ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد میرزا عبدالقیوم نے کس شوق میں وقت گزارنے کی منصوبہ بندی کی تھی؟

دوست جوابات کی نشان دہی کریں:

- i میرزا عبدالقیوم کی پرکاش کا نام تھا: (الف) کلثوم (ب) زینب (ج) خالدہ (د) نکلت
- ii پوتے کا نام تھا: (الف) احمد (ب) نوید (ج) کلیم (د) محمود

میرزا عبدالقیوم نے ساری زندگی ملازمت کی تھی:

iii

- (الف) کارپوریشن کے دفتر میں
(ب) صوبائی حکومت کے دفتر میں
(ج) بورڈ کے دفتر میں
(د) کالج میں

میرزا عبدالقیوم نے ”اولڈ تاج ہوم“ کے قیام کا اشتہار پڑھا:

iv

- (الف) ایک بار (ب) دو بار (ج) تین بار (د) چار بار

”اولڈ تاج ہوم“ کے قیام کی بنیاد رکھی گئی تھی:

v

- (الف) برطانوی طرز پر (ب) ہسپانوی طرز پر
(ج) یونانی طرز پر (د) امریکی طرز پر

افسانہ ”اولڈ تاج ہوم“ کے اہم نکات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے الفاظ میں خلاصہ تحریر کریں۔

3

میرزا ادیب کے افسانے ”اولڈ تاج ہوم“ اور تاج علی تاج کے تحریر کردہ ڈرامے ”آرام و سکون“ میں کس حد تک مماثلت موجود ہے؟

4

اولڈ تاج ہوم کے مالک ”احمد جاوید“ کی شخصیت اور خیالات کا جائزہ لیں۔ اس نے میرزا عبدالقیوم کو کس طرح ہوم میں ٹھہرنے پر آمادہ کیا؟

5

میرزا ادیب نے ”اولڈ تاج ہوم“ میں وفات پانے والے بزرگ کے خط کے ذریعے سے کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ تفصیل سے لکھیں۔

6

بزرگوں کو اولڈ تاج ہوم بھیجنا یا اس طرح کے حالات پیدا کرنا کہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں، کیسا عمل ہے؟

7

مشرقی اور مغربی خاندانی نظام کی خصوصیات پر ایک مضمون قلم بند کریں۔

8

مندرجہ ذیل جملوں کی سیاق و سباق کے حوالے سے وضاحت کریں:

9

”محمود نے ضرور اسے پہن کر دادا جان بننے کی کوشش کی ہوگی۔“

i

”زیچا اب تو یہی میری دنیا ہے۔ یہ میرا کمرہ، اسے ٹھیک ٹھاک کرنا ہوگا۔“

ii

”اس کا پوتا اور دونوں پوتیاں چلے اور کھانا اس کے کمرے ہی میں پہنچاتے رہے۔“

iii

”کتنی چالاکی سے تمیز داری کا ڈراما کر رہے ہیں۔“

iv

”دوسرے ہی لمحے اسے معلوم ہو گیا کہ وہ اس سکول کے پاس بیٹھا ہے جس میں اس کا پوتا اور پوتیاں پڑھتی ہیں۔“

v

”یورپ میں گھر کا کیا تصور ہے میں نہیں جانتا، مگر ہمارا گھر تو ہماری چھوٹی سی ایک دنیا ہوتی ہے۔“

vi



مادرانہ شفقت	فرائض منصبی	کچھ مر نکالنا	شکمن آلود	کم و بیش
شاق گزرنا	گلو خلاصی کرنا	خشمگین نظریں	ورق گردانی کرنا	اندیشہ ہائے دور دراز

خاکہ

خاکہ کے لفظی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں خاکہ ایک ایسی نثری صنف ہے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ کسی شخصیت کا بھرپور تاثر ابھارتی ہے۔ یہ کسی شخصیت کی قلمی تصویر (Pen-Sketch) ہوتا ہے۔ عمدہ خاکے کی خوبی یہ ہے کہ جس شخصیت کا خاکہ لکھا جا رہا ہو، اس کی شخصیت کے تمام تر ظاہری و باطنی خدوخال قاری کے سامنے آجائیں۔ خاکے کو بے جا طویل نہیں ہونا چاہیے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاران کے ضمن میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، چراغ حسن حسرت، شاہد احمد دہلوی، فرحت اللہ بیگ، سعادت حسن منٹو اور ممتاز مفتی وغیرہ کے نام بہت نمایاں ہیں۔

افسانہ

اُردو ادب میں افسانہ بھی مغربی ادب سے آیا ہے۔ افسانہ ایک ایسی مختصر کہانی کو کہتے ہیں، جس میں زندگی کی ایک واقعی، کردار یا کیفیت کو پیش کیا جاتا ہے۔ افسانے میں بیان ہونے والی کہانی اتنی مختصر ہونی چاہیے کہ اسے ایک نشست میں بہ خوبی پڑھا جاسکے۔

افسانے کی بنیادی خصوصیات

- اختصار
- وحدت تاثر
- جامعیت

افسانے کی اقسام

- ۱۔ مقصدی افسانہ
- ۲۔ واقعاتی افسانہ
- ۳۔ افسانہ افسانہ
- ۴۔ کرداری افسانہ
- ۵۔ معاشرتی افسانہ
- ۶۔ علامتی یا تجریدی افسانہ



ذو معنی الفاظ

کچھ الفاظ تو ایسے ہیں جن کے دو مفہوم ہوں، مثلاً:

ذو معنی الفاظ	معانی	ذو معنی الفاظ	معانی
بیت	۱۔ گھر ۲۔ شعر	ظرف	برتن ۲۔ حوصلہ
اوقات	۱۔ وقت کی جمع ۲۔ حیثیت	جست	۱۔ ایک دھات کا نام ۲۔ چھلانگ

12) درج ذیل ذو معنی الفاظ کے معانی لکھیں:

آب ظرف روزگار ہار مشتری

تشابہ الفاظ ایسے الفاظ جن کی ظاہری شکل و صورت ملتی جلتی ہو مگر وہ املا، اعراب اور معانی میں مختلف ہوں، تشابہ الفاظ کہلاتے ہیں۔ جیسے:

- ارض (عربی): زمین، جیسے: کرۂ ارض، ارض و سما
- عرض (عربی): عرض کرنا یعنی کوئی درخواست یا گزارش پیش کرنا جیسے: ادب سے عرض ہے۔
- صبح کا وقت، جیسے: سحر کا وقت تھا، معصوم کلیاں مسکراتی تھیں۔
- عمر (عربی): جادو، جیسے مقرر کی باتوں نے حاضرین پر سحر طاری کر دیا۔

13) درج ذیل تشابہ الفاظ کے معانی لکھیں:

ظن، زن اصرار، اسرار سدا، صدا کثرت، کسرت

- مرگرمیاں برائے طلبہ
- معاشرے میں ”اولڈ تایم ہوم“ کے قیام کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر گفت گو کریں۔
- ”اولڈ تایم ہوم“ کے مرکزی کردار کے جذبات و احساسات اور بدلتے ہوئے رویوں پر ایک نوٹ لکھیں۔
- افسانہ ”اولڈ تایم ہوم“ میں جن کرداروں کے درمیان مکالمے ہوئے ہیں، ان کو ڈرامائی انداز میں پیش کریں۔

- اشاراتِ مدرس
- طلبہ کو بتائیں کہ سبق کے ایک مکالمے میں ”سلام علیکم“ اور ”سلاماں لیکم“ کہا گیا ہے، جب کہ اس کا درست املا اور تلفظ ”السلام علیکم“ ہے۔ طلبہ سے لکھنے کی مشق کروائیں۔
- افسانہ ”اولڈ تایم ہوم“ میں جو اشعار آئے ہیں، ان کے شعرا کے نام بتائیں اور مفہوم واضح کریں۔
- طلبہ کو اولڈ تایم ہوم کی تصویر، ویڈیو یا انٹرویو دکھائیں۔
- والدین اور بزرگوں کے حقوق پر اسلامی تعلیمات کا حوالہ دیں۔